© rasailojaraid.com

موجودہ فرقہ وار فسادات اور اسلام

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

از

سید احمد اکبر آبادی ایم اے

نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وار کشیدگی۔ دونوں فرقوں کے بڑے بڑے اور ذمہ دار لیڈروں کے مشترکہ اعلانات کے باوجود روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس نے تمام ملک کو ایک جہنم کدۂ شر و فساد بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس فرقہ وار کشیدگی یا آپس کی مار دھاڑ کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے۔ ایک مسلمان کسی ہندو یا سکھ پر یا کوئی ہندو اور سکھ کسی مسلمان پر حملہ کرتا اور اسے مارتا ہے، یا کسی اور قسم کا اسے دکھ پہنچاتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ حملہ آور مسلمان ہے یا ہندو یا سکھ ہے، اور اس کے برخلاف جس شخص پر حملہ کیا گیا ہے وہ حملہ آور کے مذہب کے برعکس کسی اور مذہب کا پیرو ہے، اگر مذہب کا یہ اختلاف درمیان میں حائل نہ ہوتا تو یقیناً حملہ آور اپنے حریف پر حملہ نہ کرتا۔ پس جب فرقہ وارانہ کشیدگی اور موجودہ تباہ کن صورتِ حال کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے تو اب ہر فرقہ کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس پر غور کریں کہ فرقہ پروری کی جس راہ پر وہ آج گامزن ہیں اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارہ میں خود ان کے مذہب کے احکام کیا ہیں؟ کسی شخص کے لئے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مذہبی جذبہ سے ایک نہایت خطرناک کام کرے، حالانکہ خود مذہب اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے اور اُس کام کے کرنے پر اُس کو وعیدِ الٰہی اور عذابِ اخروی سے ڈراتا ہے قرآن مجید کی زبان میں اسی قسم کے لوگ ہیں جو خسر الدنیا والآخرة ذلك هو الخسران المبین۔ "دنیا اور آخرت دونوں گنوائے اور یہی بڑا ٹوٹا ہے" کا مصداق ہیں۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے انھیں بتانا چاہیئے کہ اس باب میں اُن کے مذاہب کی تعلیمات کیا ہیں؟ انھوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے یا اب کر رہے ہیں کیا اُن کے مذاہب اس کو جائز قرار دیتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اُن کو اخلاقی جرأت سے کام لیکر صاف لفظوں میں اس کا اعلان کرنا چاہیئے۔ اور اگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اُن کے لیڈروں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے ان کا مذہب اس نوع کے وحشیانہ اور غیر انسانی اعمال و افعال کو ایک لمحہ کیلئے بھی جائز نہیں ٹھہراتا تو اب اُن کا فرض ہے کہ وہ ماضی میں جو کچھ کر چکے ہیں ایک شریف اور سچے انسان کی طرح اس پر صاف دلی کے ساتھ اظہارِ ندامت و افسوس کریں اور عملاً اس کی مکافات کی سعی کریں۔

اب رہے مسلمان! تو جہاں تک ان کا تعلق ہے ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار صاف صاف لفظوں میں بتا دیں کہ اس باب میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ تاکہ ان کی روشنی میں مسلمان یہ فیصلہ کر سکیں کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی موجودہ مسموم فضا میں آئے دن دونوں طرف سے اس قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لئے حد درجہ اشتعال کا سبب ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ ہر لحاظ سے کامل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مکمل دین ہے۔ جنگ ہو یا امن، اپنوں کے ساتھ معاملہ کا سوال ہو یا غیروں کے ساتھ۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق کوئی قطعی روشنی اسلام کی تعلیمات میں موجود نہ ہو، اور ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اشتعال انگیز حالات اور شدید ترین ہیجانات کی موجودگی میں بھی وہی کام کرے جس کا اس کو خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ پھر کسی شخص یا جماعت کے بلند کیرکٹر یا اعلیٰ مکارم اخلاق کا ثبوت بھی اُسی وقت ملتا ہے جبکہ وہ سخت ناساعد اور مخالف حالات میں بھی اپنے مخصوص نظامِ اخلاق پر سختی کے ساتھ قائم رہے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اُس کے جماعتی کردار یا ملی وقار کی پیشانی کا بدنما داغ ہو۔

اس بنا پر ہم چند بنیادی حقایق بیان کرتے ہیں، امید ہے اگر مسلمانوں نے ان کو پیشِ نظر رکھا اور اس پر عمل بھی کیا تو وہ اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے لئے فلاح اور عافیت کا سامان پیدا کرسکیں گے بلکہ اپنی اخلاقی عظمت کا دوسروں کے دلوں پر ایک ایسا نقش قائم کردیں گے جو مٹانے کی لاکھ کوشش کے باوجود مٹ نہ سکے گا۔ بقول اقبال مرحوم

سجدۂ تو برآورد از دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز ترکنی پیش کساں نماز را

انسانی جان کا احترام اسلام چونکہ مذہبِ امن و عافیت ہے اور دنیا میں امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ بنی نوعِ انسان اپنے سینکڑوں قسم کے باہمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی انسانی زندگی کا احترام کرنا سیکھیں۔ تاکہ خدا کی یہ وسیع سرزمین ظلم و فساد کی آماجگاہ بننے سے محفوظ رہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں بڑے شد و مد اور تکرار و اصرار کے ساتھ انسانی جان کا احترام کرنے کی تاکید فرمائی گئی اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کیلئے شدید ترین عذابِ الٰہی کی وعید نازل کی گئی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے دو بیٹے قابیل اور ہابیل کا واقعہ بیان کرنے کے بعد جس میں ایک نے دوسرے کو بلا کسی وجہ کے قتل کیا تھا ارشاد فرمایا گیا ہے۔

من اجل ذالك كتبنا على	اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے حق میں یہ لکھ دیا کہ
بنی اسرائیل انہ من قتل نفساً بغیر	جو کوئی شخص کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس بات کے
نفس او فساد فی الارض	کہ مقتول نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد
فکانما قتل الناس جمیعا و من	کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور
احیاھا فکانما احیا الناس	جو شخص کسی کی جان بچائے تو گویا اس نے تمام
جمیعاً۔	انسانوں کی جان بچائی۔

انسانی زندگی کے احترام کے متعلق اسلام کا جو نقطۂ نظر ہے مندرجہ بالا آیتہ اس میں ایک بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے پھر اسی آیتہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

ولقد جاءتھم رسلنا بالبینات	ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر کھلی نشانیاں لیکر
ثم ان کثیرا منھم بعد ذلك فی	آئے لیکن اس کے بعد بھی ان میں ایسے بہت ہیں
الارض لمسرفون۔	جو زمین میں حدسے تجاوز کرتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسانی جان کے احترام کا فرض کسی خاص نبی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ان کی تعلیمات میں یہ حکم امر مشترک کی حیثیت سے ہمیشہ قائم اور باقی رہا ہے ایک اور آیتہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک اور قتل اولاد کی ممانعت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا ہے ارشاد ہے۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ	اور جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اس کو قتل
الا بالحق ذلکم وصاکم بہ لعلکم	مت کرو مگر ہاں اس وقت جبکہ حق کا تقاضا ہو اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعقلون۔ — نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی تاکہ تمہیں عقل آئے۔

علاوہ بریں ایک اور جگہ نیک بندوں کی صفات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

لا یقتلون النفس التی حرم اللہ — وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر

الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل — حق کے قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو

ذلک یلق اثاما۔ — کوئی ایسا کریگا پاداشِ عمل بھگتے گا۔

غور کیجئے ان آیات میں مطلق قتلِ نفس بغیرِ حق کی سخت ممانعت بیان کی گئی ہے۔ مسلم یا غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو بھی بغیر حق کے قتل کرے گا تو اس کو وہی سزا ملے گی جو کسی ایک مسلمان کے بلا وجہ قتل کرنے پر اس کو ملنی چاہئے، اہلِ عرب کے خمیر میں چونکہ قبائلی عصبیت جمی ہوئی تھی اور وہ انسانی جان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس بنا پر علاوہ قرآن مجید کی آیات کے احادیث میں بھی کثرت سے انسانی جان کے احترام اور اسکی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس طرح بار بار کی تکرار سے اسلام نے ان لوگوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ انسانی جان کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ کوئی شخص جب چاہے اپنے کسی جذبۂ ناراضگی سے متاثر ہو کر ہلاک کر دے۔ انھیں وجوہ سے جس طرح کسی انسان کو بغیر حق یعنی بغیر کسی شرعی اور قانونی وجہ کے قتل کرنا شدید ترین معصیت ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی صدمہ سے متاثر ہو کر یا کسی اور سبب کی بنا پر خود کشی کر لینا بھی عظیم ترین گناہ ہے۔ خود کشی کی ممانعت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی انسان کی زندگی اسلامی نقطۂ نظر کے ماتحت خود اُس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے جس کو وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے ہلاک اور برباد کر سکے۔ بلکہ درحقیقت وہ اس کے پاس خدا کی ایک امانت ہے جس میں وہ صرف خدا کے حکم کے مطابق ہی تصرف اور تغیر و تبدل کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ اپنے ذاتی اور نفسی احساسات و جذبات سے متاثر ہو کر حکم خداوندی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے، مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خودکشی کرکے اپنی زندگی ختم کرتا ہے یا کسی ایسے شخص کو قتل کرتا ہے جس کو قتل نہیں کرنا چاہئے تھا تو اُس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی امانت میں ناجائز تصرف کر رہا ہے اور اس طرح وہ گویا اپنے عمل سے خدا کو چیلنج دے رہا ہے۔

قومیت، وطنیت اور شعوبیت

اسلام سے پہلے عربوں میں قبائلی عصبیت کی بنا پر آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا جانی دشمن تھا۔ آج کل کی تہذیب میں قومیت اور وطنیت نے قبائلی عصبیت کی جگہ لے لی ہے اور یہی وہ معصبیتِ عظمیٰ ہے جس نے دنیا کے اسٹیج پر ہولناک ترین خونی ڈرامے کھیلے۔ اور آج بھی دنیا میں جو عام تباہی و بربادی، سفاکی و خونریزی اور وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ ایک قوم اپنے قومی خصائص کی وجہ سے جن کے عناصر سے اس کی قومیت کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے یا ایک بادۂ وطنیت کے نشہ سے سرشار ہو کر صرف اپنے آپ کو آزادی اور خوشحالی کے ساتھ زندہ رہنے کا حقدار سمجھتی ہے اور اپنے سوا خدا کے دوسرے بندوں کو جو اُس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں اُنھیں اُن حقوق سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔ اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں میں تنازع للبقا کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کشمکش منافرت عداوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بالآخر آدمؑ و حوّا کی اولاد جنگل کے بھیڑیوں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کرنے پر تل جاتے ہیں۔

انسانیت عامہ کا تصور

اسلام جو مذہبِ امن و عافیت ہے اس صورتِ حال کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اسی بنا پر قرآن نے جہاں قتلِ نفس بغیر حق کی صاف لفظوں میں ممانعت کی۔ ساتھ ہی ان تمام اسباب کی بھی نفی کر دی جو انسانی فطرت کی بے اعتدالیوں کے باعث عام طور پر اس نوع کے قتل کا سبب ہوتے ہیں اور زندگی کے محدود تصورِ قومی و وطنی کی بجائے انسانیت عامہ کا ایک اعلیٰ، بلند ترین اور ہمہ گیر تصور پیدا کیا۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يا ايها الناس انا خلقنا كم من ذكر وانثى وجعلنا كم شعوبا وقبائل لتعارفوا - | اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا ہے کہ تم پہچانے جاؤ۔

بعض آیتوں میں "من ذکر و انثیٰ" کی جگہ "من نفسٍ واحدۃ" آیا ہے یعنی ہم نے سب انسانوں کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے۔ غور کیجئے ان آیات میں خطاب صرف مومنوں یا مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام تمام انسانوں کی پیدائش خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ ایک ہی نفس سے مانتا ہے اور جہاں تک مرتبۂ انسانیت کا تعلق ہے وہ اس ہی سب انسانوں کو ایک ہی حیثیت دیتا ہے۔ رہا شعوب اور قبائل کا اختلاف تو یہ محض تعارف کے لئے ہے اور بس! ورنہ اس اختلاف کی بنا پر ایک گروہ یا ایک قوم کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے گروہ یا دوسری قوم کو انسانی حقوق سے محروم کر دے یعنی اس کو قتل کرے، اس کا مال لوٹے، اس کے گھروں کو آگ لگائے۔ اس کو مذہب بدلنے پر مجبور کرے اور اسے زندگی کی ضرورتوں سے عاری و تہی مایہ بنا دے۔ اسی مضمون کو بعض احادیث میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ "تم سب برابر ہو، تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا "کسی عربی کو عجمی پر، یا کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، یا کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔"

البتہ ہاں! اسلام میں ایک انسان کی فضیلت کا دوسرے انسان پر دار و مدار اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ پر ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ | اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم سب میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "اکرمکم عند اللہ" فرما کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ ایک نیک عمل کو بد عمل پر یا ایک دینِ حق کے ماننے والے کو باطل پرست پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اللہ کے نزدیک ہے۔ اور اس خوش نصیبی پر وہ جتنا مسرور ہو بجا ہے۔ لیکن بہر حال جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے ایک نیک عمل کو یہ ہرگز نہ چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقوق کا طلبگار ہو، بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ ایک پرہیزگار کو ایک فاسق کے مقابلہ میں اور اسی طرح ایک مسلمان کو ایک غیر مسلم کے مقابلہ میں اس مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے کہ چونکہ وہ متقی ہے اور مسلمان ہے اس بنا پر روٹی، کپڑا، پانی اور ہوا یہ چیزیں اس کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ اچھی اور عمدہ چاہئیں خوب یاد رکھئے ان تمام چیزوں کا تعلق خدا کی شانِ ربوبیت و پروردگاری سے ہے اور جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وہ رب العالمین ہے اُس کی اس شانِ ربوبیت کا فیض جمادات و نباتات اور حیوانات کی طرح تمام انسانوں کو بلا تفریقِ مذہب و نسل یکساں طور پر پہنچ رہا ہے اور اس بنا پر کسی شخص کو نیکی یا بدی۔ اسلام اور غیر اسلام کی بنیاد پر اس میں قطع و برید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آج بد قسمتی سے ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت و عداوت کی جو فضا قائم ہو گئی ہے اس کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہی ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے محض اس کے غیر مسلم ہونے کے باعث دشمنی رکھے اور وہ اس کی جان و مال کے درپے ہو۔ اسلام انسانیتِ عامہ کے جس بلند ترین تصور کا داعی و حامل ہے شیخ سعدیؒ نے اُسے نہایت بلیغ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند

یعنی پوری انسانی سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کی طرح ہے اور مختلف افرادِ انسانی اس کے اعضا و جوارح ہیں جس طرح اعضا و جوارح میں آپ دیکھتے ہیں ایک عضو تندرست ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسرا بیمار- ایک سڈول اور موزوں ہوتا ہے اور دوسرا ناہموار اور ناموزوں- ایک عضو خوبصورت ہوتا ہے دوسرا بدصورت- ایک قوی ہوتا ہے دوسرا کمزور- لیکن ان اختلافات کے باوجود بہرکیف وہ سب ہوتے ہیں ایک ہی جسم کے اجزا، جن کے باہمی تعاون واشتراک پر ہی جسم کے زندہ رہنے کا دارومدار ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح تمام افرادِ انسانی خواہ وہ مذہب- تمدن- رنگ ونسل اور قوت وضعف کے اعتبار سے کیسے ہی مختلف ہوں بہرحال وہ سب انسانی سوسائٹی کے جسم کے اعضا ہیں اور اس سوسائٹی کی خیریت اسی میں ہے کہ یہ سب افراد باہم تعاون واشتراک سے رہیں۔ پھر جس طرح اگر ایک عضو تندرست اور مضبوط ہے تو وہ دوسرے بیمار اور کمزور عضو کا دشمن ہرگز نہیں ہوتا- بلکہ ازراہِ خیرخواہی اور ہمدردی وغمگساری کے جذبہ سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو کی بیماری اور کمزوری چلی جائے اور وہ بھی اسی کی طرح مضبوط اور تندرست ہو جائے- البتہ ہاں اگر بیمار عضو کو اپنی بیماری پر اصرار ہو اور وہ تمام خیرخواہانہ مشوروں کو اپنا دشمن جان کر اپنے فساد اور مرض کو دوسرے اعضا تک متعدی کرنے لگے تو اب اس وقت اعضائے صالحہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جسم کی بقا و حفاظت کی خاطر اس عضو فاسد پر آپریشن کرائیں اور اگر دفع فساد کے لئے آپریشن بھی ناکافی ہو تو سرے سے اس عضو کا ہی خاتمہ کر دیں، آپریشن یا عضو بریدگی کے وقت تمام اعضا کو شدید کرب اور درد محسوس ہوگا لیکن بہرحال انھیں یہ انگیز کرنا چاہئے!۔

بس یہی حال انسانی سوسائٹی کا ہے جو افراد یا جو قوم دینِ حق پر قائم ہے، اعمالِ صالحہ کرتی ہے، دنیا میں نیکی کی زندگی بسر کرتی ہے وہ تندرست اور مضبوط وقوی عضو کی مانند ہے اور اس کے برخلاف جو قوم یا جو انسان ان صفات کا حامل نہیں ہے وہ بیمار اور شکستہ وخستہ عضو کی طرح ہے۔ پس اب سابق الذکر قوم کو دوسری قوم کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری تو ہونی چاہئے اور اس بنا پر اسے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ بیمار وضعیف قوم کا مرض جاتا رہے لیکن اس کے ساتھ دشمنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھنے یا اُس کے برخلاف اپنے دل میں جذبات عناد و منافرت کے پرورش کرنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے، آپ ذرا خود اپنے اوپر قیاس کرکے دیکھئے! اگر آپ خوبصورت ہیں تو کیا اس بنا پر آپ کو بدصورتوں کے ساتھ دشمنی رکھنا اور ان کو اپنا دشمن سمجھنا جائز ہو گا! اگر آپ نیک ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بدعمل انسانوں کو اپنا دشمن سمجھیں اور ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کرلیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو تبلیغ اسلام کے لئے یمن بھیجا تو انھیں تاکید کی کہ دیکھنا! تم دونوں نرمی کرنا، سختی نہ کرنا، خوش کرنا اور نفرت نہ دلانا! غور کیجئے کیا یہ رویہ دشمنوں کے ساتھ ہو سکتا ہے؟

خوب اچھی طرح یاد رکھئے! اسلام اپنے پیروؤں کو ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ وہ خود کلمہ پڑھ کر دنیا بھر سے دشمنی مول لے لیں۔ غیرمسلموں کو اپنا دشمن سمجھیں اُن سے کسی قسم کا کوئی اشتراک نہ کریں۔ اگر اسلام واقعی ایک پارس کی پتھری ہے تو ایک مسلمان بشرطیکہ وہ سچا مسلمان ہے آپ اس کو ایک لاکھ غیرمسلموں کے حلقہ میں تنہا چھوڑ دیجئے وہ ایک تنہا سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کرکے اپنے اندر جذب کر لیگا اور خود ذرا متاثر نہ ہو گا۔

قانونی مساوات اس عام انسانی مساوات و برابری کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ اسلامی قانون کی نظر میں ایک مسلم اور غیرمسلم دونوں برابر ہوں اور کسی مسلمان کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر قانون سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے، چنانچہ اسلام میں یہی ہے اور اسی کا نام عدل ہے جس طرح اگر مسلمان باغی ہو جائے یا وہ کسی شخص کو بے گناہ قتل کر دے، یا وہ شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح اگر کسی غیرمسلم سے اس قسم کا کوئی فعل صادر ہو گا تو وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہو گا اور جس طرح ایک مسلمان کے پُرامن اور غیرمجرم ہونے کی حالت میں اس کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت پر ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر کوئی غیرمسلم اسلامی حکومت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ماتحت پُرامن طریقہ پر رہتا ہے تو اُس کی جان و مال کی حفاظت بھی حکومت کا فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان بھی اس کو بے گناہ قتل کردے تو مسلمان سے اس کا قصاص لیا جائے گا ایک غیر مسلم اپنی حفاظت کا ٹیکس جس کو اصطلاح شرع میں جزیہ کہتے ہیں۔ اس کو ادا کرنے کے بعد جان و مال کے اعتبار سے بالکل ایسا ہی محترم ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک مسلمان چنانچہ صاف لفظوں میں فرمایا گیا۔

دماءھم کدماءنا و — زمیوں کے خون ہمارے خون جیسے اور

اموالھم کاموالنا — اُن کے مال ہمارے مال جیسے ہیں۔

تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں، ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، صحابۂ کرام کا طرزِ عمل، سلاطین اسلام کا اپنوں اور دوسروں کے ساتھ معاملہ، صوفیائے کرام اور بزرگانِ اسلام کا طور طریق کیا رہا ہے؟

اسلام اور عدل اگر پوچھا جائے کہ کیا کوئی لفظ ایسا ہے جس میں اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعتِ غرا کے تمام احکام و مسائل کی روح سمٹ کر آگئی ہو تو ہم کہیں گے کہ ہاں بیشک ایک ایسا لفظ موجود ہے اور وہ لفظ "عدل" ہے۔ عدل کے معنی وضع الشی فی محلہ کے ہیں یعنی کسی چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا جو ہونا چاہیے۔ اس کی ضد لفظ "ظلم" ہے جس کے معنی وضع الشی فی غیر محلہ ہے، عدل اور ظلم کے اس مفہوم و مطلب کی روشنی میں کسی مجرم کو بالکل سزا نہ دینا یا جرم کی نوعیت سے زیادہ سزا دینا ایسا ہی ظلم ہے جیسا کہ ایک بے گناہ انسان کو بلا وجہ زدوکوب کرنا اور اسے آزار پہنچانا۔ مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے خدا کے قانون عدل کو نافذ کرنے میں اپنے اور پرائے کی کبھی کوئی تمیز نہیں کی، انھوں نے اپنے ساتھ بھی انصاف کیا اور دوسرے کے ساتھ بھی! انھوں نے قانونِ عدل کے سامنے اپنی ذاتی وجاہت و شخصیت اور اپنے قلبی جذبات و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیفیات کی ذرا پروا نہیں کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں اسلام کی بے پناہ اشاعت ایک بڑی حد تک اسلام کے اسی قانونِ عدل کی وجہ سے ہوئی۔

اسلام میں عدل کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ آپ کو قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوگا۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَا یجرمنکم شنآنُ قومٍ علیٰ	کسی قوم کا بغض تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم
ان لا تعدلوا اعدلوا ھو	انصاف ہی نہ کرو (نہیں) تم انصاف ہی کرو یہی
اقرب للتقویٰ۔	پرہیزگاری سے زیادہ قریب کرنے والا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:-

ولا یجرمنکم شنآنُ قومٍ ان صدوکم	اور جس قوم نے تم کو مسجد حرام سے روکا ہے اس کا
عن المسجد الحرام ان تعتدوا	بغض تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم زیادتی کرنے لگو
وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا	اور نیکی اور پرہیزگاری پر تم ایک دوسرے سے تعاون کرو۔
تعاونوا علی الاثم والعدوان۔	اور گناہ اور زیادتی پر تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے
واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب	ڈرو۔ بیشک اللہ شدید عذاب والا ہے۔

اس دوسری آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعتِ کثیر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو ظلم و زیادتی کا کوئی دقیقہ نہیں تھا جو اس وقت مشرکین مکہ نے فروگذاشت کر دیا ہو۔ انھوں نے اللہ کے شعائر کی بے حرمتی کی۔ نہ مسلمانوں کے احرام کا لحاظ رکھا اور نہ کعبہ کی حرمت کا خیال کیا اور مسلمانوں کو مکہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے سے صاف روک دیا۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا صبر آزما اور اشتعال انگیز وقت ہو سکتا تھا۔ وہ اس حالتِ اشتعال میں جو کچھ بھی کر بیٹھتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کم تھا۔ لیکن اسلام کا ڈسپلن اور اس کی سیاست دیکھئے ان حالات میں بھی مسلمانوں کو زیادتی کرنے اور اثم وعدوان پر باہمی امداد کرنے سے منع کیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر انھیں شدید عذاب خداوندی سے ڈرایا گیا۔ مفسرین نے "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کا یہ بھی مطلب لکھا ہے کہ "اگر مشرکینِ مکہ عمرہ کرنا چاہیں تو چونکہ پہلے وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک چکے تھے اس بنا پر اس کا انتقام لینے کے لئے اب مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ وہ مشرکین کو عمرہ کرنے سے باز رکھیں۔

عدل کے سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک اور آیت بھی ہے جو مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے زیادہ واضح اور مکمل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین	اے ایمان والو تم انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہو
بالقسط شھداء للہ ولو علی	اور اللہ کے لئے گواہ بنو۔ اگرچہ وہ انصاف خود تمہارے
انفسکم او الوالدین و	اپنے یا والدین کے یا اعزہ و اقربا کے خلاف پڑتا ہو
الاقربین ان یکن غنیاً	دیکھو! خواہ کوئی دولتمند ہو یا فقیر بہرحال اللہ
او فقیراً فاللہ اولیٰ بھما	ان دونوں سے زیادہ بہتر ہے۔ تم اپنی خواہشات
فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا	کی پیروی میں عدل وانصاف سے مت پھرو اگر
وان تلوٗا او تعرضوا فان	تم نے ایچ پیچ کی بات کی یا حق سے روگردانی کی
اللہ کان بما تعملون	تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس کو جاننے
خبیراً۔	والا ہے۔

عدل کے چند تاریخی واقعات مسلمانوں نے عدل وانصاف کرنے کے ان احکام پر کیونکر اور کس طرح عمل کیا اور ان کے اس عمل نے قوموں پر کیا اثر کیا۔ تاریخ کی کتابیں ان سے پُر ہیں، ہم ذیل میں بطور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشتے نمونہ از خروارے صرف چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ ایک یہودی نے بعض صحابۂ کرام کی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا انھوں نے فوراً تلوار میان سے باہر نکال لی اور چاہا کہ یہودی کا سر قلم کر کے اس کو بارگاہِ نبوت میں گستاخی کی سزا دیں۔ لیکن سرکارِ دوجہاں نے فرمایا "عمر! میں اس یہودی کا مقروض ہوں اور لصاحب الحق یدٌ۔ ایک صاحب حق کو اپنے حق کے مطالبہ کا ہر وقت اختیار ہے۔ اگر تم کو میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ تو میری طرف سے قرض ادا کر دو۔ قرض خواہ پر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے!

(۲) بنو مخزوم قبیلہ کی ایک معزز عورت فاطمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں پیش ہوئی۔ قریش نے اُس کی سفارش حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ عزیز اور محبوب تھے آپ کی خدمت میں پہنچائی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے زبان حق ترجمان سے ارشاد ہوا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ تم سے پہلے بڑی بڑی قوموں کے برباد ہونے کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ کم درجہ کے لوگوں پر قانون جاری کرتے تھے اور ان میں سے اگر کسی معزز اور شریف آدمی سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے۔

(۳) جنگ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص گرفتار ہو کر آئے تو عام اسیرانِ جنگ کی طرح انھیں بھی قید کر دیا گیا۔ پھر زرِ فدیہ کا سوال سامنے آیا تو اس وقت اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حکم ہوا کہ گھر سے مال منگا کر دو۔ ورنہ رہا نہیں ہو سکتے۔ اب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے پاس پیغام بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اس کے جواب میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اُن کو جہیز میں دیا تھا۔ ہار دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیساختہ اپنی اول رفیقہ حیات کی یاد تازہ ہوگئی اور چشم مبارک سے آنسو نکل پڑے۔ تاہم عدل کا تقاضا ہے کہ خود اپنے اختیار سے اپنے داماد کا فدیہ معاف نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں سے اجازت طلب کرتے ہیں کہ اگر وہ پسند کریں تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کردی جائے پھر جب سب مسلمان اس کی اجازت دیدیتے ہیں تو ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کردیا جاتا ہے۔

(۴) حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے، اُن کے بیٹے عبداللہ نے ایک قبطی عیسائی کو بلاوجہ مارا تھا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع اور تصدیق ہوئی تو آپ نے باپ کے سامنے خود مضروب کے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے لگوائے اور کوئی دم نہ مار سکا۔

(۵) نجران کے عیسائیوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت وسرکشی کی تیاریاں کیں اور اس مقصد کے لئے چالیس ہزار آدمی اکٹھے کرلئے تو آپ نے صرف یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو عرب سے نکال کر دوسرے ممالک میں آباد کردیا جائے اور وہ بھی اس رعایت کے ساتھ کہ ان کی جائداد وغیرہ کی مناسب اور واقعی قیمت انھیں ادا کردی جائے۔ علاوہ بریں آپ نے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ راستہ میں جہاں کہیں سے ان کا گذر ہو ان کے لئے راحت وآسایش کے سامان بہم پہنچائے جائیں اور جب کہیں یہ مستقل قیام اختیار کرلیں تو دو سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(۶) حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہوجائے لیکن جب اس نے مسلمان ہونے سے صاف انکار کردیا تو آپ چپ ہوگئے اور فرمایا "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

(۷) حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ ابوشحمہ نے ایکمرتبہ شراب پی لی تو باپ نے خود اپنے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے مارے۔ یہاں تک کہ وہ اسی صدمہ سے جاں بحق ہوگئے۔ یہ واقعہ تاریخی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتبار سے اگرچہ کچھ زیادہ مستند نہیں ہے تاہم حضرت عمر فاروق رضؓ کی کلاہِ افتخار میں ایسے بہت سے گوہر ہائے شب چراغ ٹکے ہوئے ہیں کہ اس ایک واقعہ کے کم ہو جانے سے ان کی جلالت وعظمتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

(۸) جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج جمع کر کے مسلمانوں کو شام و فلسطین سے باہر نکال دینے اور اُن کی قوت کو کچل دینے کا عزم بالجزم کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے انتظامات کے لئے ایک ایک پیسہ کی ضرورت تھی لیکن اسلام کی شانِ عدل ملاحظہ ہو۔ اس نازک گھڑی میں بھی انھوں نے حمص کے عیسائی باشندوں کو جمع کر کے اُن سے وصول کیا ہوا خراج یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے

(۹) جنگ صفین کے موقعہ پر خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو جاتی ہے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ زرہ دار الخلافت کے ایک یہودی کے پاس ہے آپ نے اس سے مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا" یہ میری اپنی ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں رہی ہے۔ حضرت علیؓ کو یقین تھا کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ حاکمانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے اور اور قاضی شریح کی عدالت میں ایک معمولی مدعی کی حیثیت سے پہنچتے ہیں، قاضی اُن سے گواہ طلب کرتے ہیں تو آپ اپنے ایک غلام قنبر اور اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ کو پیش کرتے ہیں اس پر قاضی نے کہا" کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہوتی۔ اس لئے امام حسنؓ کی گواہی آپ کے حق میں بالکل بے کار ہے۔ یہودی یہ منظر دیکھ کر بیساختہ کلمہ پڑھنے لگا اور بول اٹھا کہ جس دین میں عدل وانصاف کا یہ عالم ہو وہ کبھی جھوٹا دین نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) حضرت عمرؓ کے پاس جب ٹیکس اور محصولات کی رقمیں آتی تھیں تو آپ ذمہ دار افسروں کو جمع کر کے اُن سے بار بار قسمیں لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ایک پیسہ بھی کسی مسلمان یا غیر مسلم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جبراً یا قطعاً وصول نہیں کیا ہے۔

(۱۱) فارس کے علاقہ میں مسلمانوں نے ایک شہر کا محاصرہ کیا۔ محصورین شکست کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے کہ اتنے میں اسلامی لشکر کے ایک غلام نے شہر والوں کے نام ایک امن نامہ لکھ کر تیر کے ذریعہ شہر میں پھینکدیا۔ محصورین یہ دیکھکر شہر کا دروازہ کھول باہر چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کے پاس یہ معاملہ گیا تو آپ نے فرمایا "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے اس بنا پر اس کے امن دینے کی وقعت بھی وہی ہے جو عام مسلمانوں کے امن دینے کی ہے۔ پس امن نافذ کیا جائے۔

یہ چند تاریخی واقعات جو آپ نے پڑھے عہدِ نبوت اور خلافت راشدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے قطع نظر اگر آپ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی عدل و انصاف کے بیشمار حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ سلطان محمد بن تغلق جیسا جابر و قاہر بادشاہ جس کو عام طور پر "خونی" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ابنِ بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھا اس کے دربار کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے سلطان محمد بن تغلق پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے میرے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا ہے۔ بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے پیدل قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور آداب تعظیم و تکریم بجالایا۔ پھر وہ کھڑا رہا اور قاضی حاکم کی حیثیت سے مقدمہ کی سماعت کرتا رہا۔ انجام کار فیصلہ یہ سنایا گیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہئے کہ مدعی کو راضی کرلے۔ ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں ایک دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے" ایک مرتبہ ایک امیر کے لڑکے نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ اس نے بلا وجہ اس کو مارا ہے۔ معاملہ قاضی کے سامنے گیا تو اس نے باقاعدہ مقدمہ کی سماعت کرکے فیصلہ دیا کہ" یا تو بادشاہ لڑکے کو راضی کرلے ورنہ قصاص دے۔ یہ تو خیر ہوگیا لیکن اس واقعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ابنِ بطوطہ لکھتا ہے "میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے اس فیصلہ کے بعد دربار میں آکر لڑکے کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی دیکر کہا کہ "لے اب مجھ سے اپنا بدلہ لے" اور مزید برآں اس کو اپنے سر کی قسم دیکر کہا کہ جیسا میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اسی طرح مار۔ اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو اس کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی۔[1]

جنگ اور اسلامی اخلاق

کسی قوم کے قومی اور جماعتی اخلاق و کردار کے لئے سب سے زیادہ آزمائش اور ابتلا کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ وہ کسی قوم سے برسرِ پیکار و جنگ ہوتی ہے۔ اسی موقع پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون درحقیقت بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کا مالک ہے اور کون اس سے محروم ہے۔ مسلمان کا ہر کام یہاں تک کہ کسی کے ساتھ اس کی دوستی اور دشمنی، صلح اور جنگ یہ سب چونکہ محض احکامِ خداوندی کی تعمیل و بجاآوری کے لئے ہوتا ہے اور کسی چیز میں اس کے اپنے حظِ نفس اور ذاتی لطف و تلذذ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی شان یہ رہی ہے کہ جنگ کے نازک سے نازک موقع پر بھی انھوں نے اسلام کے قانونِ عدل و انصاف کا سررشتہ اپنے ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُن کو اسلامی قانونِ عدل کی سچائی کا اس درجہ یقین تھا کہ اگر کسی وقت اس پر عمل درآمد کرنے میں انھیں بظاہر اپنی شکست کا اندیشہ یا کمتری و بےچارگی کا احساس پیدا ہوا بھی تو وہ اسے ہنسی خوشی انگیز کر گئے اور اپنے قدم کو سرِ جادۂ انصاف سے ایک لمحہ کیلئے نہیں ہٹنے دیا۔

قتل بغیرِ حق اور قتل بالحق کا فرق

شروع میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ قتل بغیرِ حق کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ "بغیرِ حق" کی قید ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ قتل بالحق نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فتنہ و فساد اور جبر و ظلم کے قلع قمع کرنے اور دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کرنے کے لئے واجب

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ضروری ہے۔ قتل بالحق کب واجب ہوتا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک جزیہ کی تشریح کی ہے۔ یہاں اُن تمام تفصیلات کو بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ گنجایش۔ البتہ ہاں ایک بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ قتل بالحق کا اختیار کسی حالت میں بھی کسی فردِ واحد کو نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی اگر فرض کیجئے کسی ایک شخص نے کسی کو بے گناہ قتل کردیا اور قاتل کو مقتول کے کسی وارث نے پکڑ لیا تو اب وارثِ مقتول کو خود یہ حق نہیں ہے کہ وہ قاتل کا سر قلم کردے اور اس طرح اُس سے قصاص لے لے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ حکومت کے سپرد کردے بہرحال خوب یاد رکھئے کہ کسی شخص واجب القتل کو قتل کرنے یا کسی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا اور پھر اسی کے مطابق اُس سے معاملہ کرنے کا حق کسی ایک مسلمان کو انفرادی حیثیت میں ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ حق ہے صرف اسلامی گورنمنٹ کا۔ اور اگر گورنمنٹ باقاعدہ طور پر موجود نہ ہو تو پھر اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت جس کو عام نمایندگی حاصل ہو وہ اس کا اعلان کرسکتی ہے۔

جنگ میں ممنوع افعال | باقاعدہ طور پر اعلانِ جنگ ہوجانے کے بعد بھی مسلمانوں کو جن اخلاقی احکام پر کاربند ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ بے شبہ وہ جنگی اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ جنگ کی حالت میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں سے جنگ کریں جو اُن سے جنگ کررہے ہوں یعنی باصطلاحِ شرع مقاتلین ہوں، ان کے برخلاف وہ لوگ جو پُرامن شہری کی حیثیت رکھتے ہوں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہ ہو مثلاً بوڑھے، عورتیں، بچے، مذہبی پیشوا اور عبادت گذار لوگ ان میں سے کسی کا قتل جائز نہیں ہے۔ علاوہ بریں درختوں کا کاٹنا، کھیتوں کو آگ لگانا، مکانوں کو منہدم کرنا، یا فریقِ مخالف کے کسی فرد کو غیر انسانی سزا دینا۔ مثلاً اُس کو زندہ آگ میں جلا دینا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر مارنا یا اُسے بجبر مذہب کے تبدیل کرنے پر آمادہ کرنا۔ یہ تمام وہ اعمال وافعال ہیں جو اسلامی اصول وآداب... جنگ کے مطابق فریقِ متحارب کے ساتھ بھی نہیں کئے جاسکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگ میں معاہدہ کی پابندی

علاوہ بریں دورانِ جنگ میں اگر مسلمانوں اور فریقِ مخالف میں کوئی معاہدہ ہوجائے تو اسلام کا حکم ہے کہ مسلمان سختی سے اس کی پابندی کریں اور جب تک فریقِ مخالف ہی اس کی خلاف ورزی نہ کرے مسلمان برابر اس پر جمے رہیں۔ معاہدہ کی پابندی کی خوب عجیب وغریب اور انتہائی حیرت انگیز مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر دکھائی ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخِ عالم کا پورا دفتر اس کی نظیر پیش کرنے سے یکسر عاری و قاصر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تقریباً ڈیڑھ ہزار جاں نثاروں کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مقام حدیبیہ پر آپ کو روک لیا جاتا ہے اور مشرکینِ مکہ مصر ہیں کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہوکر عمرہ ادا نہیں کرنے دینگے۔ آخر دونوں میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جو بظاہر مسلمانوں کے لئے معلوبانہ ہے لیکن دراصل یہ معاہدہ ہی بعد کی تمام شاندار فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہو اور اسی بنا پر خود قرآن نے اس کو فتح کے لفظ سے تعبیر کیا۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر آئے گا تو مسلمانوں پر ضروری ہوگا کہ وہ اسے مشرکین مکہ کے حوالہ کردیں اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ادھر سے بھاگ کر مکہ میں پناہ لے گا تو اہلِ مکہ پر ضروری نہ ہوگا کہ وہ مفرور کو مسلمانوں کے حوالہ کریں۔

اتفاق دیکھئے کہ ابھی یہ معاہدہ لکھا ہی جارہا تھا کہ عین اس موقع پر ایک مسلمان ابوجندل بن سہیل کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں پاؤں میں بوجھل بیڑیاں ہیں جسم پر زخموں کے نشان ہیں اور کہتے ہیں کہ یارسول اللہ! مجھے بچائیے۔ ابوجندل کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اسی تاثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی سخت کلامی کر بیٹھتے ہیں جس کا اُن کو عمر بھر افسوس رہتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ ابوجندل کو واپس نہ کرنا معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا تھا۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے فرماتے ہیں ؎ ابوجندل!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ جو اور کمزور مسلمان ہیں اُن کے لئے کوئی راہ نکالیگا۔ اب صلح ہو چکی ہے اور ہم اُن لوگوں سے بدعہدی نہیں کرسکتے نتیجہ یہ ہوا کہ ابوجندلؓ کو عہدنامہ کے مطابق اسی حالت میں پابزنجیر مکہ واپس جانا پڑا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک لمحہ کے لئے یہاں ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور کرو کہ یہ جو کچھ ہوا آخر اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی؟ اول تو بدر و حنین کے وہ فاتحین صف شکن جن کے جلو میں فرشتوں کے ان دیکھے لشکر (جنود لم تروها) چلتے تھے ان کے لئے ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ صلح کرتے۔ سرورِ کائنات کا اس موقع پر اگر ذرا بھی اشارا ہوجاتا تو جن تلواروں نے اس واقعہ کے تین سال بعد ہی مکہ فتح کیا وہ اب بھی نیام سے باہر آکر اپنی خاراشگافی کا منظر دکھا سکتی۔ اور کفار مکہ کا قلع قمع کرسکتی تھیں۔ اچھا پھر معاہدہ ہوا بھی تو اس قدر مغلوبانہ کہ حضرت عمرؓ ایسا شجاعت و حمیتِ اسلامی کا شیر عرب اس پر بل کھا کھا کے رہ گیا۔ پھر یہ سب کچھ کس کی موجودگی میں، اور کس کے حکم سے ہوا؟ اس نبی برحق اور پیغمبر آخر الزماں کے حکم سے کہ جس کا ایک اشارۂ چشم و ابرو گردشِ افلاک کے پورے نظام کو زیر و زبر کردینے کے لئے کافی تھا! پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ یہاں عہدنامہ بظاہر دب کر کیا جارہا ہے لیکن ادھر عالمِ غیب سے مژدہ سنایا جارہا ہے۔

انا فتحنا لك فتحاً مبيناً ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

اگر غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس پورے واقعہ میں ڈسپلن۔ بہترین سیاست اور اعلیٰ ترین ضبط نفس و تعمیل احکامِ خداوندی کا سبق موجود ہے اس میں اس بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو موقع محل دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ وہ جب چاہیں جذبات سے بے قابو ہوکر تلوار میان سے باہر نکال لیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ کسی مصلحت سے کوئی معاہدہ کریں تو انھیں عواقب و نتائج سے بے پروا ہوکر اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے! اگر انھوں نے ایسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توانجام کار فلاح وبہبود اور کامیابی وکامرانی انھیں کو ہوگی۔

اب اس سلسلہ میں ایک واقعہ عہدِ فاروقی کا بھی سُن لیجئے! ۲۳ھ میں مسلمانوں کی ایک فوج نے سیستان کے ایک شہر زرنج کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ محصورین چند روز کے بعد اس شرط پر صلح کرتے ہیں کہ اُن کی تمام زمینیں محفوظ رہیں گی۔ مسلمان اس شرط کو منظور کر لیتے ہیں اور پھر اس پر عمل اس طرح کرتے ہیں کہ جب کھیتوں کی طرف سے گذرتے ہیں تو جلدی سے گذر جاتے ہیں کہ زراعت چھونک نہ جائے۔

معاہدہ کی پابندی کے حکم کی انتہا یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو چکا ہو اور پھر مسلمانوں کی ہی کوئی جماعت معاہد مسلمانوں سے اُن کافروں کے خلاف کوئی مدد مانگے تو قرآن کا صاف حکم ہے کہ مسلمانوں کو معاہدہ کا خلاف کر کے کافروں کے مقابلہ میں اپنے دینی بھائیوں کی بھی مدد نہیں کرنی چاہئے۔ ارشاد ہے۔

وان استنصروکم فی الدین	اور اگر تم سے تمہارے بھائی دین کے معاملہ میں مدد
فعلیکم النصر الا علی قوم	طلب کریں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ مگر
بینکم وبینھم	ہاں اس قوم کے خلاف اُن کی مدد نہ کرو جن میں اور
میثاق۔	تم میں کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل اس عام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی آیت میں صحابہ کرام کی شان یہ بیان کی گئی ہے "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اشداء علی الکفار کے معنی کافروں پر سختی کرنے والے ہیں۔ حالانکہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جان سکتا ہے کہ اشداء جمع شدید کی ہے اور شدت سے مشتق ہے جو ضعف کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ پھر شدید کے صلہ میں "علی" کا آنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں شدید کے معنی مضبوط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستحکم اور قوی کے ہیں نہ کہ تشدد اور سختی کرنے والے کے اس بنا پر مفہوم یہ ہوا کہ صحابۂ کرام آپس کے معاملات میں بڑے رحمدل، ملنسار اور نرم خو ہیں، لیکن جب حق اور باطل کا اسلام اور کفر کا معاملہ آجاتا ہے تو وہ پہاڑ کی طرح مضبوطی کے ساتھ امر حق پر جمے رہتے ہیں اور اس وقت کسی قسم کی کوئی مداہنت نہیں دکھاتے اور اس طرح کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں اور در حقیقت یہی وہ صفت ہے جو ان کے اعتدال قوی اور توازنِ فکر و عمل کی دلیل ہے۔ یہی شدید کا لفظ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بھی آیا ہے "انّ بطش ربّك لشدید" یہاں بھی شدید کے معنی مضبوط کے ہیں نہ کہ تشدد اور بے جا سختی کے۔ کیونکہ انّ اللہ لیس بظلام للعبید فرما کر خود بے جا سختی کی جس کا دوسرا نام ظلم ہے نفی کردی گئی ہے۔

موجودہ فرقہ وارانہ معاملات سطورِ بالا میں آپ نے جو کچھ پڑھا اُس سے ایک اجمالی اندازہ اس بات کا ہو گیا ہوگا کہ حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ دونوں صورتوں میں اسلام کا نظامِ اخلاق و معاملات اس قدر اعلیٰ اور بلند رہتا ہے کہ اس پر کاربند ہونے سے انسانی شرف و مجد نہ صرف یہ کہ پست نہیں ہوتا بلکہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حق کے لئے مسلمانوں نے تلوار اٹھائی اور شجاعت و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا آج تک ان پر حیران ہے لیکن چونکہ ان کی جنگ بھی خالصۃً لوجہ اللہ ہوتی تھی اور سخت غیظ و غضب کے عالم میں بھی خدا اور رسول کے احکام کی پابندی کرتے تھے اس بنا پر جو قومیں ان کی تلوار کی زخم خوردہ ہوتی تھیں وہی ان پر پروانہ وار فدا ہونے لگتی تھیں۔ گویا وہی مثل ہوئی "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا"

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، پھر جب وہ عراق واپس بلایا گیا تو اس کی محبت و عقیدت اہلِ سندھ کے دلوں میں اس درجہ جڑ پکڑ چکی تھی کہ یہ لوگ بے ساختہ روتے تھے اور انھوں نے مقام کیرج میں اس کا ایک اسٹیچو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بطور یادگار رہنا کر رکھا۔

اب آئیے اس پر غور کریں کہ ملک کے موجودہ حالات کی روشنی میں مسلمانوں کا معاملہ برادرانِ وطن کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے اور انھیں کس زمانہ کے نظامِ اخلاق پر عمل کرنا چاہئے! اس سوال کا فیصلہ اس امر کی تنقیح پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت حالتِ امن ہے یا حالتِ جنگ ؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل دونوں قوموں میں کشیدگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور متعدد مقامات پر اس کشیدگی کا بخار سخت ترین خونریزی اور شدید قسم کی سفاکی و بربریت کی شکل میں ظاہر بھی ہو چکا ہے! لیکن یہاں معاملہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایک قوم نے من حیث القوم دوسری قوم کے خلاف باقاعدہ و باضابطہ اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور اب اشتراک و تعاون کے تمام تعلقات یکقلم منقطع ہو گئے ہیں ؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ بحالتِ موجودہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے محکوم ہیں۔ خود مختار حکومت نہ ان کے پاس ہے نہ اُن کے پاس۔ اس بنا پر نہ اعلانِ جنگ اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل نہ ادھر سے ہو سکتا ہے اور نہ ادھر سے۔ پھر جنگ کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحارب فریق دو الگ الگ کیمپوں میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں، اور یہاں ایسا نہیں ہے ہندو اور مسلمان سب محلہ بمحلہ، بلکہ خانہ بخانہ اور کوچہ بکوچہ رہتے ہیں بلا زمتوں میں ایک افسر ہوتا ہے دوسرا ماتحت، دفتروں میں ساتھ بیٹھتے ہیں۔ تجارت میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہیں، ملوں میں اور کارخانوں میں، دکانوں پر اور بازاروں میں دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں دونوں شریک ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی انسان بصحتِ ہوش و حواس یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ و پیکار ہیں اور ان کا حکم متحارب قوموں کا ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ گاندھی جی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مسٹر جناح دونوں اپنے مشترکہ اعلان میں صاف صاف باہمی خانہ جنگی اور آپس کی مار دھاڑ کی شدید مذمت کر چکے اور اس کو ہندوستان کے روشن نام کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بتا چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ دونوں لیڈر اور ان کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے بڑے لیڈر بھی مسلسل اپیلیں کر رہے ہیں کہ دونوں قوموں کو رواداری اور سہار کے ساتھ پر امن طریقہ پر رہنا چاہئے۔ اور اپنی قوم کے لیڈروں کی نسبت یہ سمجھنا اشد ترین غلطی ہے کہ یہ لوگ زبان سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اُن کے دل میں نہیں یا خلاف واقعہ ہے۔ ایسا سمجھنے کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ خدانخواستہ ہمارے لیڈر بزدل اور کمزور بھی ہیں اور منافق بھی۔ ایسی صورت میں جبکہ کوئی اپنی گورنمنٹ قائم نہیں، کسی قوم کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنے لیڈروں کی رہنمائی پر اعتماد کرے اور اُن کے کہنے پر چلے۔

علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر خدا نے مسلمانوں کو صلح کر لینے اور جنگ نہ کرنے کا جو حکم دیا تھا۔ خود خدا نے قرآن مجید میں اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ مکہ میں اس وقت کچھ مسلمان مرد اور عورتیں ایسی تھیں جن کا علم مسلمانوں کو نہیں تھا ایسی صورت میں اگر جنگ کا حکم دیدیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اِن مسلمانوں کی بے خبری میں مکہ ہی رہنے والے قلیل التعداد مسلمان مرد عورت برباد ہو جاتے چنانچہ ارشاد ہے۔

ولولا رجالٌ مومنون ونساءٌ	اور اگر مومن مرد اور عورتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے
مومناتٌ لم تعلموهم ان	جن کو تم پامال کر دیتے اور ان کی وجہ سے تم کو نقصان
تطؤهم فتصيبكم منهم معرة	پہنچ جاتا بغیر علم کے (اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا تم کو
بغير علم-	جنگ کا حکم کر دیتا)

اس آیت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک مقام کے مسلمانوں کے جنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ کسی دوسری جگہ کے مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں تو مسلمانوں کو ہرگز جنگ نہ کرنی چاہئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ صلح کرلینی چاہیے۔ اب اس آیت کو پیش نظر رکھکر ہندوستان میں مختلف قوموں کی آبادیوں کی پوزیشن پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کہیں ہندو اکثریت میں ہیں اور کسی جگہ مسلمان۔ پس ایسی صورت میں اگر بالفرض اکثریت والے صوبہ کے مسلمان جنگ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیت والے صوبہ کے مسلمانوں پر اس کی زد پڑیگی اور انھیں شدید ترین خطرہ لاحق ہو جائے گا اس کو ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کی جان اتنی ہی قیمتی اور رفیع ہے جتنی کہ دس پچاس سو مسلمانوں کی۔ اس بنا پر آیت بالاسے جہاں یہ ثابت ہوا کہ جب تک اقلیت والے مسلمانوں کی حفاظت وبقا کا بندوبست نہ ہو اکثریت کے مسلمانوں کے لئے جنگ کرنا یا جنگ کے اسباب پیدا کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ کوئی اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے اکثریت کا اقلیت کو بالکل نظر انداز کردینا، ان کے مفاد کا خیال نہ رکھنا، یا بالفاظ صحیح تر سیاسی اعتبار سے اقلیت کو غیر مسلم حکومت کا محکوم بنا دینا۔ شرعاً اس کو بھی کیونکر گوارا رکھا جا سکتا ہے؟

تقریر مذکورۂ بالا کی روشنی میں اب اس حقیقت کے واضح اور مبرہن ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ موجودہ حالات میں ہندو اور مسلمان دو متحارب قومیں نہیں البتہ ہاں دو متخاصم قومیں ضرور ہیں یعنی دونوں نے ارباب خصومت کی حیثیت سے اپنا مقدمہ برطانوی اقتدار اعلیٰ کی عدالت میں پیش کر رکھا ہے دونوں طرف کے وکیل اور نمایندے اپنی اپنی قوم کی طرف سے وکالت کر رہے ہیں اور مقدمہ اپنے حق میں جیت لینے کی سعی کر رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ازروئے فقہ اسلامی، متخاصم اشخاص یا گروہ کا وہ حکم نہیں ہوتا جو متحارب اشخاص و گروہ کا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں آئینی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ آئینی جنگ کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا بلکہ صرف سیاسی لیڈروں اور نمایندگانِ قوم کے ساتھ ہوتا ہے اس بنا پر موجودہ حالات میں خود عوام کے آپس میں لڑنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ انھیں باہم شانتی اور امن سے رہنا چاہیے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے حسب ذیل نتائج و تنقیحات برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) ہندو اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ نہیں بلکہ حالت امن ہے، اس بنا پر جنگ کے احکام پر عمل کرنا قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔

(۲) چونکہ آبادیاں مخلوط ہیں اور مجموعی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس بنا پر مسلمانوں کا فرض ہے کہ جنگ سے حتی الوسع باز رہیں اور جن اسباب سے اشتعال پیدا ہوتا ہو مثلاً گالی گلوج دینا۔ کسی کی تہذیب اور مذہب کو برا کہنا اور اُس کا مذاق اڑانا۔ کسی قوم کے بڑے آدمی کی تضحیک کرنا، ان سب چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلامی شرافتِ اخلاق بھی اس کی مقتضی ہے اور موجودہ حالات بھی اس کے داعی ہیں۔

(۳) جو مسلمان بلا وجہ کسی غیر مسلم پر حملہ کرتا ہے اس کو صاف اور کھلے دماغ کے ساتھ مفسد اور خود مسلمانوں کا دشمن سمجھنا چاہئے اور اس بنا پر کسی مسلمان کو اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس کے اس ایک فعل کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ایک مضروب کے بدلہ میں کئی جگہ دو مسلمان مارے جائیں گے۔

(۴) گھروں میں آگ لگانا، تبدیلِ مذہب پر جبر کرنا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، زنا کرنا، یہ تمام چیزیں تو خود حالتِ جنگ اور قتالِ شرعی کی صورت میں بھی ناجائز اور شدید معصیت ہیں۔ اس بنا پر حالت امن میں اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے!

مدافعت کے لئے تیار رہنے کا حکم

اس میں شک نہیں کہ آج حالات بڑے صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہیں، غنڈے اور بدمعاش مذہب کا نام لیکر شہری امن کو تباہ و برباد کرنے کی مساعی میں لگے ہوئے ہیں۔ با اینہمہ چونکہ دونوں قوموں کے ارباب حل و عقد نے امن کی اپیلیں کر رکھی ہیں اس بنا پر غنڈوں کی ایک یا متعدد جماعتوں کے فعل کی وجہ سے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ایک قوم من حیث القوم متحارب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حملوں کی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ تو اس کا صاف اور کھلا جواب یہ ہے کہ جو لوگ یا جو افراد بلاوجہ مسلمانوں پر اس طرح کے حملے کریں، وہ بے شبہ مفسد، فتنہ پرداز، ظالم اور دشمنِ انسانیت و شرافت ہیں۔ ان کا بہر نوع مقابلہ کرنا چاہئے اور اس پامردی، استقلال اور جوانمردی سے کرنا چاہئے کہ جب تک ظالم اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچ جائے دم نہ لیا جائے۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اسلام اور کمزوری دو ایسی متضاد و متناقض چیزیں ہیں جو اک ساتھ جمع نہیں ہوتیں مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے کسی سے رحم و کرم کی بھیک نہیں مانگتا بلکہ اپنی حفاظت خود کرتا اور دوسروں کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیتا ہے کہ قرآن نے اسے قوامون بالقسط کا منصب سپرد کیا ہے۔ اسی قسم کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے قرآن مجید کا حکم ہے۔

وَاَعِدُّوا لَہُم مَّا استطعتم من قوۃ	اور جو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ تم اُن (اپنے
ومن رباط الخیل ترھبون بہ	دشمنوں) کیلئے مہیا کر سکتے ہو وہ مہیا کر رکھو تاکہ ان
عَدُوَّ اللہ وعدوکم واٰخرین	کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے
من دونھم لا تعلمونھم۔ اَللہُ	علاوہ دوسرے لوگوں کو جنھیں تم نہیں جانتے
یَعْلَمُھُم۔	مگر اللہ جانتا ہے۔ ڈرا سکو۔

پھر اسی آیت میں آگے چل کر یہ بھی فرمادیا گیا کہ اس تیاری کے سلسلہ میں مسلمان جو کچھ خرچ کریں گے وہ سب اللہ کے راستہ میں ہوگا جس پر آخرت میں ان کو ثواب ملے گا اور دنیا میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن پر ظلم نہیں کیا جا سکیگا۔

وما تنفقوا من شئی فی سبیلِ اللہ یُوَفَّ	اور جو کچھ تم اللہ کے راستہ میں خرچ کروگے وہ تم کو پورا پورا
الیکم وانتم لا تظلمون (الانفال)	دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جاسکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے علاوہ سورۂ نساء کی ایک آیت ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا خذوا	اے ایمان والو تم اپنے بچاؤ کی تمام تدبیریں
حذرکم فانفروا ثبات او انفروا	کرلو اور سامان لیلو پھر جدا جدا ہوکر نکلو
جمیعاً۔	یا اکٹھے ہوکر۔

غور کیجئے! پہلی آیت میں دو چیزوں کے تیار رکھنے کا حکم ہے ایک "قوۃ" اور دوسرا "رباط الخیل" ان میں سے اول الذکر چیز سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ اور حفاظت کیلئے وہ تمام چیزیں تیار اور آمادہ رکھنی چاہئیں جو ان کے لئے قوت و طاقت کا ذریعہ ہوں۔ مثلاً آج کل تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، علم اور سائنس، سیاسی دور اندیشی اور سمجھ بوجھ یہ وہ تمام آلات و اسباب ہیں جن سے ایک قوم مضبوط اور طاقتور قوم بنتی ہے۔ اور ہمارے زمانہ میں تو یا اس درجہ کارگر اور موثر حربہ ہیں کہ انہیں کے ذریعہ ایک قوم دوسری قوم کو فتح کر رہی ہے۔

اب رہا "من رباط الخیل" تو اس سے مراد اسلحۂ جنگ ہیں۔ پس اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے "بسطۃً فی الجسم" کے ساتھ بسطۃً فی العلم بھی حاصل کرنا چاہئے تاکہ کوئی قوم ان پر جبر و ظلم اور عدوان و زیادتی نہ کر سکے۔ یہی حال دوسری آیت میں لفظ "حِذر" کا ہے۔ حذر کے معنی بچنے کے ہیں اور حذر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے بچاؤ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس کے مفہوم میں عقل و خرد، سیاست۔ ڈسپلن۔ اقتصادی و معاشی خوشحالی۔ آلات و اسلحۂ جنگ یہ سب داخل ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں کو ان چیزوں کے فراہم رکھنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کا مقصد کسی کو ستانا، لوٹنا، کھسوٹنا اور قتل و غارت کرنا نہیں بلکہ خود اپنی حفاظت اور بچاؤ کرنا اور اپنے سے دفاع کرنا ہے۔ ایک مسلمان کی شان سے جس طرح یہ بعید ہے کہ وہ ظالم اور مفسد ہو، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ مظلوم و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقہور اور نشانۂ شر و فساد بنے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کو عام طور پر حکم دیا کرتے تھے۔

وعلموا اولادکم العوم والرمایۃ — تم اپنی اولاد کو تیرنا اور تیر چلانا سکھاؤ۔

بات چونکہ بالکل بے لاگ ہو رہی ہے۔ اس بنا پر یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر اکے دکے حملے ہونے لگیں تو ان کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان بھی اسی طرح جواب ترکی بترکی دینا شروع کر دیں۔ ورنہ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو حملہ آور قوم کے لوگ شیر ہو جائیں گے اور وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان کو اور زیادہ ستائیں گے۔ ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام ایک دینِ حق ہے۔ اس کا نظام ہر جہت کامل و مکمل ہے اس کے احکام بالکل صاف اور کھلے ہیں جن میں کوئی ایچ پیچ یا کسی قسم کا کوئی گنجلک نہیں ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس شخص نے کسی ایک راہ چلتے مسلمان پر حملہ کیا ہے وہ بے شبہ ظالم اور مفسد ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہئے جو ظالمین و مفسدین کے ساتھ از روئے قانون کرنا چاہئے — مسلمانوں کو سعی کرنی چاہئے کہ ایسا فتنہ پرداز پکڑا جائے اور اس کو قرار واقعی سزا ملے۔ لیکن اگر بالفرض وہ گرفتار نہیں ہوتا تو اب اس کے اس فعل کا انتقام کسی دوسرے شخص سے لینا حالانکہ وہ بالکل پر امن ہے اور اس سے کسی مسلمان کو کوئی آزار نہیں پہنچا ہے، شرعاً عقلاً یا اخلاقاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے اگر مسجد میں کسی نے آپ کے جوتے چرا لئے ہیں اور اصل چور کا پتہ نہیں لگتا تو کیا آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ آپ چوری کی واردات کو روکنے اور اس کا سدباب کرنے کی غرض سے کسی دوسرے شخص کا جوتہ چرا لیں۔

آج کل کا مغربی طریقِ فکر یہ ضرور ہے کہ Ends Justify Means. یعنی کسی عمدہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن خوب یاد رکھئے کہ اسلام اس طریقِ فکر سے کلی طور پر ابا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک اعلیٰ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائز و بلند مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لئے وسائل و ذرائع بھی نیک اور جائز اختیار کئے جائیں۔ اگر ایک طاقتور اور تندرست نوجوان شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسلام صحت و تندرستی کی خاطر اس نوجوان کو زنا کرنے کی یا ایک غریب آدمی کو اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے علاج معالجہ کے لئے چوری کر لینے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ پھر ایک مسلمان پر انفرادی حملہ کے جواب میں کسی ایک غیر متعلق غیر مسلم پر انفرادی حملہ کرنے سے آپ کا مقصد بھی تو حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سے اور اشتعال بڑھے گا اور اب اور دوسرے مسلمانوں پر حملے ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرم تو بچ جائے گا اور دوسرے بے گناہ لوگ طرفین سے خواہ مخواہ تیغِ ستم کا نشانہ بن جائیں گے۔ بہرحال جب تک ایک قوم من حیث القوم شرعاً متحارب قرار نہیں پاتی فاقتلوھم حیث ثقفتموھم پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج کل کے انتہائی صبر آزما حالات اور عقل و جذبات کی شدید ترین کشمکش کے زمانہ میں توازنِ فکر و عمل پر قائم رہنا بہت مشکل ہوگیا ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے "جام و سنداں باختن" کا پہلے بھی مظاہرہ کیا ہے اور اب پھر کرسکتے ہیں۔ ضرورت اس یقین کے پیدا کرنے کی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیوی کامیابی و کامرانی کا دارومدار صرف قرآن کی تعلیمات اور اسلامی فضائل اخلاق پر کاربند ہونے اور ان پہ جمے رہنے پر ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو قرآن کی بشارت انھیں کے لئے ہے۔

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی

علماء و مشائخ کا اجتماع

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم۔ اے

دہلی، اسلامی ہند کی ابتداء سے صوفیاء اور علماء کا مرکز رہی ہے۔ دجلہ و فرات سے علم و عرفاں کی جو موجیں اٹھی ہیں وہ جمنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں۔ بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں، وہ یہیں آکر ٹھہرے ہیں۔ اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں، قدم قدم پر مدرسے[1] تھے، کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں، دور دور سے شائقین علم و فضل یہاں آکر جمع ہوتے تھے۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کا یہ دارالسلطنت "رشکِ بغداد و غیرتِ مصر"[2] بنا ہوا تھا۔ یہاں کے شاعر اس طرح اس کی عظمت اور بلندی کا اعلان کرتے تھے ؎

حضرتِ دہلی کنفِ دین و داد — جنتِ عدن است کہ آباد باد

ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات

---

[1] چودہویں صدی عیسوی کا ایک مورخ شہاب الدین العمری لکھتا ہے کہ صرف دہلی میں ایکہزار مدرسے، دو ہزار کے قریب خانقاہیں اور شفاخانے ہیں۔ (مسالک الابصار۔ ص ۲۹۔ انگریزی ترجمہ ۱۹۴۳ء مطبوعہ لاہور)

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ از ضیاء برنی۔ ص ۲۴۱۔ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی سرسید ایڈیشن)

© rasailojaraid.com